

تزکیہ نفس

تزکیہ علم

[میری زیر ترتیب کتاب "تزکیہ نفس" کی دو ابتدائی فصلیں جو مقدمہ کتاب کی حیثیت رکھتی ہیں ترجمان بابت فردی و مارچ سلسلہ میں نکل چکی ہیں۔ اس کے بعد میرے گرفتار ہو جانے کے سبب یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اب یہ سلسلہ دوبارہ شروع کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے توفیق اور فرصت نصیب ہو۔]

اس کتاب کو جیسا کہ میں نے اس کے مقدمہ میں واضح کر دیا میں نے تین بابوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں تزکیہ علم سے متعلق مباحث ہیں، دوسرے میں تزکیہ عمل کی تفصیلات ہیں اور تیسرے میں تزکیہ تعلقات و معاملات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ مضمون جو ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے کتاب کے پہلے باب (تزکیہ علم) کی پہلی فصل ہے [ابن حسن اصلاحی]

علم کے تزکیہ پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مختصراً یہ بتائیں کہ حقیقی علم ہے کیا اور اس علم کے حصول کے وسائل و ذرائع کیا ہیں۔

علم خواہ کسی معمولی سے معمولی بات کا بھی ہو بہر حال علم ہے اور وہ جہل کے مقابل میں انسان کو فطرتاً غیر ذمہ غروب ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس علم کی پیاس انسان کے اندر سب سے زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہے، جس علم کو وہ سب سے پہلے ڈھونڈتا ہے اور جس علم کو وہ دوسرے تمام علموں پر ترجیح دیتا ہے یہ علم محض اس کائنات کے چند طبعی قوانین و ضوابط کے جان لینے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم چند ماعداً طبعی سوالات کے اطمینان بخش حل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سوالات اگرچہ ماعداً طبعی ہیں اگرچہ ان سوالات کا تعلق انسان کے بالکل قریبی ماحول سے براہ راست نہیں ہے اور اگرچہ ان کے حل پونے

سے انسان کی کوئی مادی ضرورت بھی بظاہر لپدی نہیں ہوتی، تاہم ہر معقول انسان کے فکر و ذہن پر ان کا اس قدر غلبہ ہوا کرتا ہے کہ آدمی اپنے بالکل پاس کے سارے سوالات کو چھوڑ کر سب سے پہلے انہی مابعد الطبیعی سوالات کے حل کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

بادی النظر میں یہ بات کچھ عجیب سی ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن اگر گہری نگاہ سے انسان کا ذہنی و فکری تجربہ کیا جائے تو اس امر واقعہ سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اسباب خواہ کچھ ہی ہوں لیکن انسان اسی ترتیب سے سوچتا ہے اور اسی ترتیب سے وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے سامنے پہلے یہ سوال نہیں آتا کہ اس کا جو جسم ہے وہ کن اجزاء سے بنا ہوا ہے بلکہ پہلے وہ اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کو پیدا کس نے کیا ہے؟ اسی طرح اس کے ذہن میں پہلے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جو پانی وہ پی رہا ہے اس میں کن کن اجزاء کی کتنی کتنی مقدار شامل ہے اور جو غذا وہ کھا رہا ہے وہ کن کن وٹامینز جوہرل پر مشتمل ہے بلکہ ان سوالات کے پیدا ہونے سے پہلے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذات کو جن جس نے اس کے لیے بلا استحقاق یہ حوائج کرم بچھایا ہے اور اس ذات کی صفات کیا ہیں اور اس کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ علیٰ ہذا القیاس اس کے ذہن کو پہلے اس تحقیق کی خواہش پریشان نہیں کرتی کہ جس زمین پر وہ چل رہا ہے وہ گول ہے یا چبٹی، ساکن ہے یا متحرک بلکہ سب سے پہلے اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس وسیع زمین کو اتنے عجائب کے ساتھ وجود میں کون لایا ہے اور وہ اس کو وجود میں لا کر خود کہاں چھپ کے بیٹھا ہوا ہے؟ وہ اپنے اوپر اس ستقب نیلگوں کو اور اس کے ساتھ ان ہزاروں لاکھوں ستاروں اور چاند اور سورج کو دیکھ کر نہ تو اس بات کے دریافت کرنے کے درپے ہوتا کہ یہ جو ایک چھت سی اسے نظر آرہی ہے فی الواقع یہ چھت ہی ہے یا یہ محض ایک خلائی لافنا ہی ہے؟ وہ دور بینوں نے کچھ چاند کے اندر نظر آنے والے دھبوں کی تحقیقات کے لیے دوڑا ہے، نہ سورج اور زمین کے درمیان کے فاصلہ کی پیمائش کی فکر میں سرگرداں ہوتا ہے بلکہ سب سے پہلے اگر اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے حل کے لیے بچپن ہوتا ہے تو وہ یہ سوال ہے کہ وہ کون ہے جو اتنی جبرت انگیز چیزوں کو وجود میں لایا ہے اور ان چیزوں کے وجود میں لانے سے اس کا مقصد کیا ہے؟

انسان کے سوچنے کا یہ انداز اس کے دہی پن کا یا محض اس کی ذہنی اپرج کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ اس کو پاس کی چیزیں چھوڑ کر دُور کی کوڑی لانے کا کچھ شوق ہے۔ بلکہ فی الواقع سوچنے کی صحیح ترتیب ہی یہی ہے۔ یہی سوال حقیقت وہ سوال ہے جس کے حل ہونے سے اس کی روح اور اس کی عقل کو نشی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ سرا ہے جو مل جائے تو اس کائنات کا سارا الجھاؤ لمحہ بھر میں سلجھ سکتا ہے اور اگر نہ ملے تو انسان قیامت تک سہماتا رہتا ہے لیکن وہ کسی ایک گہ کو بھی نہیں کھول سکتا اور اگر کوئی گہ کھولتا بھی ہے تو اس گہ کے اندر سے ہزاروں گہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سوال کو حل کیے بغیر اس دنیا میں انسان بڑی جہازوں پر اڑنے اور ایٹمی آلات جیسی خطرناک چیزیں ایجاد کرنے کے باوجود بھی اس کائنات کے متعلق بالکل اندھیرے ہی میں رہتا ہے۔ وہ ایک گھر کے اندر ہے لیکن اس کو کچھ پتہ نہیں کہ یہ گھر کس کلبے ہے؟ وہ اس گھر کی مختلف چیزوں کو توڑ پھوڑ رہا ہے، ان کو الٹ پلٹ رہا ہے، ان کو اپنے استعمال میں لا رہا ہے لیکن اس کو کچھ خبر نہیں کہ اس کے یہ سائے تصرفات اس گھر والے کی مرضی کے مطابق بھی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کی بے شمار نعمتوں سے آواز نہ ممتنع ہو رہا ہے لیکن اسے کچھ معلوم نہیں کہ ان تمام نعمتوں کے جواب میں اس گھر والے کی طرف سے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عاید کی گئی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کے ہر حصہ میں دندنا رہا ہے لیکن اسے کچھ علم نہیں کہ اس گھر والے کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس گھر کو گھر والے نے اس کو ہمیشہ کے لیے سونپ دیا ہے یا اس میں صرف اس کو چند دنوں کی عارضی سکونت کی اجازت دی ہے؟ اگر عارضی سکونت کی اجازت دی ہے تو اس کے ساتھ کچھ شرطیں بھی ہیں یا یہ حق تصرف بالکل بے قید و شرط ہے؟ اگر کچھ شرطیں ہیں تو وہ شرطیں کیا ہیں؟ اور اگر وہ شرطیں پوری نہ ہو سکیں تو گھر والا ان کے متعلق کوئی بار پرس بھی کرے گا یا نہیں؟

غور کیجئے کہ کیا کسی کو دن سے کو دن آدمی کی نسبت بھی یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی عالیشان اور آراستہ و پیراستہ محل کے اندر جاتا رہے گا، اس کی ہر چیز سے بے لکلف فائدہ اٹھانا شروع کر دیگا، اس کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک کونے کی تحقیق و تفتیش شروع کر دے گا، اس کے مخفی خزانوں اور پوشیدہ وقینوں تک کی چھان بین کرنے لگ جائے گا اور وہ یہ سب کچھ کتنے سے پہلے یہ دریافت

کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرے گا کہ اس محل کا مالک کون ہے؟ وہ اس کو اپنے محل کے اندر گھسنے دینے کا ارادہ رکھتا ہے یا نہیں؟ اور اگر بالفرض وہ اس کو اس میں کچھ تصرف کرنے کی اجازت دے بھی رہا ہے تو اس پر اس نے کچھ پابندیاں اور شرطیں بھی عائد کی ہیں یا بغیر کسی پابندی اور بغیر کسی شرط ہی کے اس نے اپنا پورا محل اس کے حوالہ کر دیا ہے؟ ایک چور اور ایک نقب زن تو بلاشبہ کسی تحقیق و تفتیش کے چکر میں پڑے بغیر اس طرح کے کسی محل میں جا گھسے گا اور اس میں من مانے تصرفات بھی شروع کر دے گا لیکن کسی تشریف آدمی کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کبھی اس قسم کی جسارت کر سکے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عاقل آدمی کے اندر سب سے پہلے اس کائنات کے متعلق یہ مابعد الطبعی سوالات جو پیدا ہوتے ہیں وہ عین اس کی فطرت کی بڑ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی سوالات ہیں جو پیدا ہونے چاہئیں اور انہی کے صحیح جواب سے دراصل اس کے روح و دل کو حقیقی طمانیت و مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور انہی سے علم حقیقی کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔

جب آدمی کو اس کائنات کے خالق و مالک کا سراغ مل گیا تو اس کو گویا وہ کلید مل گئی جس سے علم حقیقی کے تمام دروازے کھولے جاسکتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے فکر کے لیے وہ نقطہ آغاز مل جاتا ہے جہاں سے تحقیق و تفتیش کا صحیح قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد انسان یہ سوال طے کر سکتا ہے کہ دنیا کہاں سے آگئی ہے، اس کے بعد وہ خود اپنی حیثیت اور اپنے مرتبہ کو بھی متعین کر سکتا ہے، اس کے بعد وہ آفاق و انفس کے مطالعہ سے اس خالق و مالک کی صفوں کا بھی علم حاصل کر سکتا ہے اور ان صفوں کو بغیر غم و غم و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے کسوٹی بھی بنا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے یہ سوال حل کر لینا بھی کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ اس کے لیے زندگی بسر کرنے کی پسندیدہ روش کیا ہے اور ناپسندیدہ روش کیا ہے۔ بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی سعادت و مسرت اور فوجوں کے عروج و زوال سے متعلق کیا اصول جاری ہیں۔

انسان کی انفرادی و اجتماعی سعادت سے متعلق یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جو سب سے پہلے حل ہونے چاہئیں۔ ان کے حل ہو جانے کے بعد جہاں تک انسان کی عقلی و روحانی طمانیت کا تعلق ہے وہ اس کو حاصل

ہو جاتی ہے۔ رہی اس کی مادی و جسمانی آسائش تو وہ اپنی سعی و کوشش اور اپنے تجربی علم کے ذریعہ سے قدرت کے قوانین کے دریاقت کرنے اور ان کو اپنے معاشی و تمدنی مصالح کی ترقی میں استعمال کرنے کا سلیقہ جس قدر بڑھاتا جائے گا اسی قدر اپنی معاشی خوشحالیوں میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔

خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم | اس تفصیل سے ایک حد تک یہ بات قیو واضح ہو گئی کہ تحقیقی علم جس سے انسان کی روح اور اس کے دل کو طمانیت و تسلی حاصل ہوتی ہے اس کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے لیکن یہاں ہمیں مختصراً یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس مسئلہ کی وضاحت اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہمارے اربابِ تصوف کے یہاں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے معاً آدمی کا ذہن خدا کی ذات اور اس کی تجلیات و انوار کے مشاہدہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن ہم اس لفظ سے ہرگز اس قسم کی کوئی چیز مراد نہیں لے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سے خدا کے متعلق صرف مندرجہ ذیل باتوں کا جاننا مراد ہے۔

(الف) تفصیلی دلائل کے ساتھ اس بات کا علم کہ خدا ہے۔

(ب) پوری وضاحت کے ساتھ خدا کی صفات کا علم۔

(ج) اس بات کا علم کہ وہ فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو پسند کرتا ہے اور فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو ناپسند کرتا ہے۔

(د) اس بات کا علم کہ دنیا میں وہ افراد اور جماعتوں کے ساتھ فلاں فلاں قوانین کے تحت معاملہ کرتا ہے۔

(ه) اس بات کا علم کہ مرنے کے بعد بھی اسی سے سابقہ پڑنے والا ہے اور وہ اپنے نیک اور بد بندوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرنے والا ہے۔

خدا کے متعلق اگر مذکورہ بالا باتیں ایسے دلائل کے ساتھ معلوم ہو جائیں جو دل کے اندر اطمینان پیدا کریں تو اس کی معرفت کے لیے ان کے بعد کسی اور بات کے جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور اگر باتیں ایک شخص کو معلوم نہ ہوں تو اگرچہ وہ اپنے خیال میں ہر آن تجلیات و انوار کا مشاہدہ کر رہا ہو لیکن

وہ خدا سے بالکل بے خبر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس معرفت کے مدراج ہوتے ہیں، اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس معرفت کی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مختلف عارفین کی معرفت میں فرق ہو کر رہے، اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ معرفت کسی شخص کے لیے محض قائل ہوتی ہے اور کسی کے لیے حال بھی بن جاتی ہے لیکن معرفت کے دائرہ میں بہر حال وہی چیزیں آتی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ ان سے آگے بڑھ کر اگر انسان خدا کی ذات کا مشاہدہ یا اس کی ذات کی معرفت حاصل کرنا چاہے یا ذات کی تجلیات و انوار دیکھنا چاہے تو یہ چیز اس کے امکان سے باہر ہے۔ انسان کو جو عقل ملی ہوئی ہے اس کی رسائی صرف خدا کی صفات ہی تک ہے، خدا کی ذات کا وہ کوئی تصور کہہ ہی نہیں سکتی، اسی طرح انسان کو جو حواس عطا ہوئے ہیں وہ صرف خدا کی نشانیوں اور اس کی آیتوں ہی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ خدا کی تجلیات اور اس کے انوار کا مشاہدہ ان کی قوت برداشت اور ان کے تحمل سے باہر ہے۔ قرآن مجید میں یہود کے متعلق بیان ہوا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ جب تک وہ ان کو فائیت الہی کا حکم کھلا مشاہدہ نہیں کرائیں گے اس وقت تک وہ ان کی یہ بات ہرگز باور نہیں کریں گے کہ خدا ان سے کلام کرنا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبہ کو قبول کرنے کے بجائے اس کو ان کی سرکشی اور حماقت کا نتیجہ قرار دیا اور ان کی اس گستاخی کی سزا میں اپنے حلال کی ایک ذرا سی نمود سے ان سب کو بہوش کر دیا۔

اور یاد کرو جبکہ تم نے موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ تمہاری
بازِ قلتم یٰموسیٰ لَنْ اُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی
نَوٰی اللّٰہُ جَہْرَۃً فَاَخَذْنَا کُمُ الصّٰعِقَۃَ وَ
اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَا کُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ
لَعَلَّکُمْ فَتَحُکُمْ ۝ (نفرہ - ۵۵-۵۶)

اور یاد کرو جبکہ تم نے موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ تمہاری
بات نہیں ماننے کے یہاں تک کہ ہم خود خدا کو حکم کھلا
نہ دیکھیں تو تم کو کرک نے آدلو چاؤنم دیکھنے کے دیکھتے
رہ گئے۔ پھر ہم نے تم کو تمہاری یہ ہوشی کے بعد اٹھایا تاکہ
تم شکر گزار بنو۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ انسان کے لیے خدا کی ذات کا مشاہدہ بالکل محال ہے۔ وہ خدا کو صرف اس کی نشانیوں اور اس کی آیتوں کی ادٹ ہی سے دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن مجید میں مذکور ہے کہ انہوں نے خدا کی ذات

کا مشاہدہ کرنے کی تمنا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا کہ تم میری ذات کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، میری تجلی کی تاب تو پہاڑ بھی نہیں لاسکتا تو تم کس طرح لاسکو گے، تم صرف میری نشانیوں کا اور میری صفات کے مظاہر کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ظاہر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوا اور اس کے خداوند نے اس سے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اسے میرے خداوند مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ اس نے جواب دیا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے، پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر رکاوٹ نہ بنے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے خداوند نے پہاڑ پر اپنی تجلی ظاہر کی تو اس کو پاش پاش کر دیا اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے تو بولے کہ تو پاک نہیں تیرے حضور توبہ کی لود میں پہلے ایمان لانے والا نبی ہوں۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ
قَالَ رَبِّ ارْنِيْ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ط قَالَ لَنْ تَرَانِيْ
لَكِنْ اَنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنْ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ
فَسَوْفَ نَرَانِيْ فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ
رَكًا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَرَعًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ
سُبْحٰنَكَ تُبٰتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ
(۱۲۳ - اعراف)

یہی بات احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

مجاہد النور لو کشفه لا حرققت
سجحات و جہد ما انتہی الیہ لبعث من خلقه رسل
اس کا حجاب نور ہے، اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو
ایکے چہرہ نور سے صاری مخلوق جل کے دجا جہان تک اس کی نظر

اس سے معلوم ہوا کہ ذات الہی اور اس کی تجلیات کے مشاہدہ کی تاب حضرات انبیائے کرام بھی نہ لاسکے چر جائیکہ عام لوگ۔ اس وجہ سے جو لوگ خدا کی ذات یا اس کی تجلیات کے مشاہدہ کے درپے ہوتے ہیں اور اس غرض کے لیے مجاہدے اور مراقبے کرتے ہیں ہمارے نزدیک وہ ایک سعی لاحاصل میں اپنا وقت ضائع کرنے میں بلکہ ایسے لوگوں کے بارہ میں یہ کہنا بھی کچھ بیجا نہ ہوگا کہ یہ لوگ درحقیقت اس گستاخی کے مرکب ہوتے ہیں جس گستاخی کے مرکب یہود ہوتے اور لازماً وہ اسی سزا کے بھی مستحق ہیں

جو ہنرا اس گستاخی پر یہود کو دی گئی۔

بعینہ یہی حقیقت مختلف طریقوں سے حدیثوں میں بھی سمجھائی گئی ہے کہ آدمی کو اپنی عقل کو اللہ تعالیٰ کے بارہ میں غور کرنے کی چھوٹ اسی وقت تک دینی چاہیے جب تک وہ اس کی صفات و آیات اور اس کی شانوں اور اس کے کثمتوں پر غور کرے۔ جب وہ اس حد سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات سے متعلق سوالات اٹھانے شروع کرے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ فوراً وہیں رک جائے اور شیطان کے فتنوں سے خدا کی پناہ مانگے۔ کیونکہ یہ سوالات اس کے ذہن میں شیطان کی دوسرہ اندازی ہی کے سبب پیدا ہو رہے ہیں اور ان کا نتیجہ حیرانی و درماندگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے اور شیطان اس کو اس جگہ میں صرف اس لیے ڈال رہا ہے کہ اس طرح اس کو کفر اور الحاد میں مبتلا کر دے۔ اسی حقیقت کو مندرجہ ذیل حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يأتى الشيطان احدى كذا فيقول من خلق كذا من خلق كذا حتى يقول من خلق ربك فاذا بلغه فليستعذ بالله فلينته۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور یہ سوال شروع کرتا ہے کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی، فلاں چیز کس نے بنائی، یہاں تک کہ یہ سوال کرنے لگتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا جب

بات یہاں تک پہنچ جاتے تو اس کو چاہیے کہ شیطان کے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگے اور سوچنا بند کر دے۔

معرفت الہی حاصل کرنے کا طریقہ معرفت الہی کی اہمیت اور اس کا اصلی مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس معرفت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب اس مسئلہ پر غور کرتے دانے مختلف گروہوں نے مختلف دیا ہے۔ ہمارے لیے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے اس وجہ سے ہم صرف تین گروہوں سے بحث کریں گے ایک فلاسفہ، دوسرے متکلمین، تیسرے صوفیہ۔ ان گروہوں کے اندر بھی اس سوال کے جواب میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کے سبب ان میں سے ہر گروہ مختلف فرقوں میں بٹ گیا ہے۔ ہم ان اختلافات سے قطع نظر کر کے اس بارہ میں عام فلاسفہ، عام متکلمین اور عام صوفیہ کی جو رائے ہے وہ اختصار کے ساتھ پیش

کرتے ہیں۔

فلاسفہ کی رائے | فلاسفہ خواہ قدیم ہوں یا جدید ان میں سے جو کسی نوعیت سے بھی خدا کے قائل ہیں (اور انہی سے یہاں بحث ہے) وہ خدا کی معرفت کے لیے انسان کی فطرت اور اس کی عقل کو بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیدا کرنے والے نے انسان کو عقل اور فطرت کی رہنمائی دے کر اس کو کسی غریب غیبی رہنمائی کی ضرورت اور اس کی مداخلت سے بالکل مستغنی کر دیا ہے۔ عقل کا چراغ ہر تاریکی میں اجالا کرنے کے لیے ان کے نزدیک کافی ہے۔ اس اندرونی ہادی کی رہنمائی حاصل ہو جانے کے بعد کسی معاملہ میں بھی انسان ان کے خیال میں اس بات کا محتاج نہیں رہا کہ وہ الہام حاصل کرنے کے لیے اپنے سے کسی خارج رہنما کی طرف متوجہ ہو۔ ان کے نزدیک عقل انسان کے سارے طبعی اور مابعد الطبعی سوالات حل کر سکتی ہے اور اگر وہ نہیں حل کر سکتی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری عقل ان سوالات کو حل کرنے کے قابل ہی نہیں ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ابھی ہماری عقل ترقی کے اس درجہ پر نہیں پہنچی ہے کہ ان سوالات کو حل کر سکے عقل کی رہنمائی پر یہ اعتماد صرف انہی فلسفیوں نے نہیں ظاہر کیا ہے جو رسالت اور نبوت کے سلسلہ کے منکر ہیں بلکہ سلسلہ نبوت و رسالت کے قائل فلسفیوں نے بھی عقل پر یہی اعتماد ظاہر کیا ہے۔ وہ بھی فلسفہ کے زیر اثر عقل کے ساتھ اس قدر حسن ظن رکھتے ہیں کہ اس کو انسان کی رہنمائی کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور اگر مذہب کے زیر اثر دینی زبان سے کسی مذہب نبی اور رسول کی رہنمائی کی ضرورت تسلیم کرتے بھی ہیں تو محض عوام کا لانعام کے لیے۔ فلاسفہ اور حکما کو انبیاء کی رہنمائی کی احتیاج سے مستغنی کر دیتے ہیں۔

متکلمین کی رائے | اس کے بالکل برعکس نظریہ ہمارے متکلمین کی اکثریت (بالخصوص اشاعہ) کا ہے۔ یہ لوگ انسان کی عقل اور فطرت کو ان مابعد الطبعی سوالات کے حل کے لیے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے بالکل ناکارہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک عقل صرف انہی سوالات کا کچھ اٹا سیدھا حل معلوم کر سکتی ہے جن کا تعلق اس عالم محسوس سے ہے۔ اس عالم محسوس سے ماوراء حقائق تک پہنچنے کے لیے ان کے نزدیک عقل کے پاس کوئی ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ان معاملات میں انسان ایک عاقل مخلوق ہونے کے باوجود ان لوگوں کے نزدیک بالکل ایک مادہ و اندھے سے مشابہ ہے جو چند قدم چلنے کے لیے بھی کسی عصا کش

کا محتاج ہوتا ہے۔ اور اگر عصا کش نہ ہو تو ہر قدم پر یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑے۔ اسی وجہ سے عام فلاسفہ انسان کو کسی مافوق عقل رہنمائی سے جس شدت کے ساتھ بالکل مستغنی ثابت کرتے ہیں اس سے زیادہ شدت و قوت کے ساتھ یہ لوگ انسان کو اس مافوق عقل رہنمائی کا محتاج ثابت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان سائے سوالات کو، جو انسان کی زندگی سے حقیقی تعلق رکھنے والے ہیں صرف خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء ہی حل کر سکتے ہیں عقل سے یہ لوگ اس قدر بدگمان ہیں کہ نہ صرف یہ کہ عقل ان سوالات کا کوئی حل دریافت نہیں کر سکتی بلکہ انبیاء ان سوالات کے جو حل بتاتے ہیں عقل ان کی قدر و قیمت بھی نہیں بتا سکتی۔ بلکہ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک انبیاء کی بتائی ہوئی باتوں میں عقل کو سرے سے کوئی دخل ہے ہی نہیں۔ یہاں تک کہ خود نبی کے پہچاننے کے لیے بھی ان لوگوں کے نزدیک کوئی عقلی کسوٹی موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ نبی کو صرف اس کے معجزات کے ذریعہ سے پہچانتے ہیں، اس کی تعلیم، اس کی حکمت اور اس کے اخلاق کو اس کے پہچنوانے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلم اخلاقی اصولوں کے بارہ میں بھی عقل اور انسان کی فطرت کو کوئی فیصلہ کن معیار تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نظریہ کے لحاظ سے جھوٹ کی برائی اور سچ کی اچھائی بھی کوئی عقلی اور وجدانی شے نہیں ہے، انبیاء نے سچ کو اچھا کہا اس وجہ سے وہ اچھا ہے اور جھوٹ کو بُرا کہا اس وجہ سے وہ بُرا ہے۔ اگر وہ اس کے بالکل برعکس فیصلہ دے جاتے تو عقلی حقیقت سے جھوٹ کے اچھے ہونے اور سچ کے بُرے ہونے میں بھی کوئی فبا حتمہ ان کے خیال میں نہیں تھی۔

صوفیہ کی رائے | صوفیہ کے نزدیک خدا کی معرفت واصل کرنے کا اصلی ذریعہ وجدان، کشف اور مشاہدہ ہے۔ ان لوگوں نے معرفت کا معیار اس قدر اونچا رکھا ہے کہ وہاں تک عقلی اور استدلالی علم کے پہنچنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ جس علم کی بنیاد استدلال پر ہو وہ ان حضرات کے نزدیک ایک پائے چوبیس اور اس پائے چوبیس کے ذریعہ سے معرفت کی منزل نہیں طے کی جاسکتی۔ سچے پائے استدلالیاں چوبیس بود مولانا رام نے اپنی ثمنوی میں عقل کی نارسائیوں پر جو کچھ لکھا ہے اور جس زور سے لکھا ہے یہ ان کے اکیسے کی آواز نہیں ہے بلکہ انہوں نے درحقیقت صوفیہ کے ہر طبقہ کی ترجمانی کی ہے۔

حضرات صوفیائے کرام کی یہ رائے صرف فلاسفہ اور حکماء ہی کے علم کے بارہ میں نہیں ہے کہ وہ معرفت کے مقصد کے نقطہ نظر سے ناکارہ ہے اور اس کی حیثیت ایک پائے چوبیس کی ہے بلکہ وہ علم شریعت بھی جس کی بنیاد وحی پر ہے، ان حضرات کے نزدیک حقیقی معرفت کے مقصد کے نقطہ نظر سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ اکابر صوفیہ علم شریعت کی تحقیر نہیں کرتے لیکن بہر حال اس کی حیثیت ان کی نظر میں ”علم ظاہر“ سے زیادہ نہیں ہے اور یہ ”علم ظاہر“ چاہے ان کے نزدیک تحقیر اور استخفاف کا مستحق نہ ٹھہرے تاہم اس کا مرتبہ ان کی نظر میں ان کے اپنے علم باطن کے برابر نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیوں نے ترنگ میں آکر علم شریعت کے بارہ میں ایسے الفاظ بھی استعمال کر دیئے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم باطن کے مقابل میں اس کو کوئی خاص وقعت نہیں دیتے۔ مثلاً ایک شیخ تصوف کا ارشاد ہے کہ ”ہم اپنا علم ایک ایسی ذات سے حاصل کر رہے ہیں جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والی نہیں اور تم اپنا علم ایک ایسے زندہ سے حاصل کر رہے ہو جسے ایک دن بہر حال مرنا ہے“ ایک دوسرے بزرگ سے کہا گیا کہ ”آپ عبدالرزاق سے حدیث حاصل کرنے کے لیے سفر نہیں کرتے؟“ جواب میں ارشاد فرمایا کہ ”جو خود خلاق سے حاصل کر رہا ہو وہ عبدالرزاق سے کیا حاصل کرے گا۔“ ایک اور شیخ کا ارشاد ہے کہ ”العلم حجاب بین القلب و بین اللہ عز و جل“ ”علم دل اور اللہ کے درمیان ایک حجاب بن جاتا ہے“ ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے ”اذا رأیت الصوفی یشتغل بمجد ثنا و اخبرنا فاعسل یدک منہ“ جب تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ حدیثنا اور اخیرنا کے چکر میں پڑ گیا ہے تو بس اس سے ہاتھ دھو لو۔“

۱۔ یہ اقوال ہم نے مراجع السالکین ج ۲ ص ۲۳۹ سے لیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس علم کو قرآن مجید ”العلم“ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے کسی اور علم کے اتباع کو وہ اتباع ہوا اور اتباع ضلالت قرار دیتا ہے اس علم کی قدر و قیمت ہماری صوفیوں کے ایک گروہ کے نزدیک کیا ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ

وَلَئِنْ أَنْبِئْتَ أَهْلَ دَهْرِهِمْ بَعْدَ الذِّكْرِ
جَارَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا كُنْتَ مِنَ اللَّهِ مِنْ دَرَجَةٍ
وَلَا لَصَبِيرٍ - (بقرہ ۱۲۰)

اور اگر تم نے اس ”العلم“ کے بعد جو تمہارے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے مقابل میں تمہارا کوئی کارساز اور مددگار نہ ہوگا۔

صوفیوں کے نزدیک علم اور معرفت کے جو مدارج ہیں اور جس علم کو وہ علم اور جس معرفت کو وہ معرفت کہتے ہیں ہم یہاں مختصراً اس کی وضاحت کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دوسروں کے معیار علم و معرفت اور ان کے معیار علم و معرفت میں کیا فرق ہے اور اس علم و معرفت کے حاصل کرنے کے ان کے ہاں ذرائع کیا ہیں۔ اس وضاحت کے لیے ہم پانچویں صدی ہجری کے مشہور امام نصّوف شیخ الاسلام ابو اسمعیل ہروی حنبلی منوفی سلمہ کی یادگار تصنیف منازل السائرین سے پہلے علم کی حقیقت اور اس کے مختلف مدارج کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم معرفت کی حقیقت اور اس کے مراتب پر ان کی رائے نقل کریں گے۔

راقیہ حاشیہ ۳۵) دوسری جگہ ہے :

وَلَكِنْ أَتَّبَعْتُ أَهْوَاءَ هُمُومٍ بَعْدَ مَا
جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ -
اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے بعد اس کے کہ تمہارے
پاس العلم آچکا ہے تو تم اس وقت ظالموں میں سے
ہو گے۔ (رقبہ۔ رکوع ۱۷)

لیکن ہم اے صوفیوں کا ایک طبقہ اس علم کو حجاب سمجھتا ہے اور اگر وہ کسی کو اس علم کی طلب میں مشغول پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ شخص ضائع ہو گیا۔ یہاں تک کہ صوفیوں کے نزدیک علم کی اصطلاح ایک حیران انگیز اصطلاح بن گئی ہے اور جس چیز کو وہ علم حقیقی سمجھتے ہیں اس کو وہ علم کی اصطلاح کے بجائے معرفت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے لیے قرآن و حدیث کی استعمال کی ہوئی اصطلاح کو استعمال کرنا پسند نہیں کرتے۔

صوفیوں نے اپنے مخصوص علم کے لیے یہ جو مخصوص اصطلاح بنائی ہے، علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج السالكين میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن انہوں نے اس کا سبب نہیں بیان کیا کہ آخر صوفیوں کو قرآن اور حدیث کی اصطلاح کو چھوڑ کر ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ؟

میرے نزدیک ان لوگوں کو اس نئی اصطلاح کے وضع کرنے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ علم یا العلم کی اصطلاح علم دجی اور علم شریعت کے لیے معروف ہو چکی تھی اور اس علم کو یہ حضرات اپنے علم کے مقابل میں محض ایک علم ظاہر کی حیثیت دیتے تھے اس وجہ سے انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اس علم کے لیے یہ کوئی اصطلاح وضع کریں جس سے علم کو وہ علم شریعت افضل اور بزرگ سمجھتے ہیں۔ درجوان کے نزدیک علم حقیقی کی حیثیت کا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے معرفت کی اصطلاح اختیار کر لی۔

۱۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی مدارج السالكين میں شروع میں منازل السائرین کا متن دیا ہے (باقی صفحہ پر)

شیخ الاسلام نے علم کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے :-

(۱) وہ بدیہی علم جو آدمی کے حس و مشاہدہ میں آتا ہے یا جس کی بنیاد قابل اعتماد نقل و روایت پر ہے یا جو سابقہ تجربات کی صحت پر مبنی ہے۔

(۲) وہ علم خفی جو پاکیزہ حسوں کی پاکیزہ روحوں کے اندر نشوونما پاتا ہے، جو بے ریا ریاضت کے پانی سے سیرابی حاصل کرتا ہے، جو بلند ہمت اشخاص کے نفاس صادقہ کے اندر خلوت کے اوقات اور دنیا کے ہنگاموں سے نا آشنا کانوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۳) وہ علم لدنی جس کا وجود ہی اس کی سند ہے، جس کا اندک ہی اس کا مشاہدہ ہے، جس کا حکم ہی اس کی تعریف ہے۔

ان میں سے پہلے درجہ کے علم کی صوفیوں کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے بھی اس کا ذکر بالکل ایک ابتدائی درجہ کی چیز کی حیثیت سے کیا ہے اور ایک لفظ بھی اس کے متعلق ایسا نہیں لکھا ہے جس سے ذرا بھی اس کی اہمیت واضح ہوتی ہو۔ حالانکہ علم شریعت بھی ان حضرات کے نزدیک اسی درجہ میں داخل ہے اس لیے کہ وہی علم ہے جس کی بنیاد قابل اعتماد نقل و روایت پر ہے۔

دوسرے درجہ کے علم کے بارے میں شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ ”وہ علم بیظہر الغایب و لغیب الشہادۃ و بشیر الی الجمع“ یہ علم غیب کو ظاہر اور حاضر کو غایب کر دیتا ہے اور مقام جمع کی طرف رہبری کرتا ہے۔

اس عبارت کی شرح اپنی طرف سے کرنے کے بجائے میں شیخ الاسلام کی کتاب کے سب سے بڑے شارح علامہ ابن قیم کے وہ الفاظ یہاں نقل کیے دیتا ہوں جو انہوں نے اپنی کتاب مدارج السالکین میں اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :-

”وہو بیظہر الغایب“ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز عارف سے اوچل ہوتی ہے یہ علم اس چیز

کا کشف کر دیتا ہے۔ ”و لغیب الشہادۃ“ سے یہ مراد ہے کہ یہ علم عارف کو اس کے مشہود حقیقی

(تفسیر ۲۳) میں یہاں اس کے مطالبہ اور پیش کردہ گنا جو صاحب اصل عبارتیں دیکھنا چاہیں وہ مذکور کتاب کی اہمیت کی

کے سوا ہر چیز کے مشاہدہ سے بے خبر کر دیتا ہے۔" ویشیر الی الجمع" میں وحدانیت و فردانیت کے مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں تمام رسوم و قیود مٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ خود نشا بد بھی اپنے آپ کو اس فردانیت میں گم کر دیتا ہے۔

علم کا تیسرا درجہ جس کو شیخ الاسلام نے علم لدنی سے تعبیر فرمایا درحقیقت یہی علم ارباب تصوف کے یہاں علم و معرفت کی حقیقی معراج ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے اس کی شان میں یہاں تک فرما دیا ہے کہ "لیس بینہ و بین الغیب حجاب" علم لدنی اور غیب کے درمیان سرے سے کوئی پردہ حائل ہی نہیں رہ جاتا۔ اس کی تعریف میں بھی شیخ الاسلام نے جوفہ سے ارشاد فرمایا ہے ان کی وضاحت بھی نہیں اپنی طرف سے کرنے کے بجائے بہتر سمجھنا ہوں کہ ان کی تفسیر میں جو کچھ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے اسی کو یہاں درج کر دوں۔ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں :-

"اسنادہ وجودہ" اس کا وجود ہی اس کی سند ہے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس کے علاوہ جو علم ہے اس کے حصول کا راستہ اسناد ہے اسی طرح اس علم کے حصول کا راستہ وجدان ہے۔ و ادراک عیانہ اس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم فکر اور استنباط سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ کشف اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ و لغتہ حکمہ جس کا حکم ہی اس کی تعریف ہے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ اپنی دلیل ہے اس کی دلیل کہیں اور سے نہیں لانی پڑتی وہ خود دلیل اور خود مدلول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہ جاتا، بخلاف علم کی دوسری اقسام کے کہ ان کے درمیان اور غیب کے درمیان پردہ حائل رہتا ہے۔ صوفیوں کے نزدیک اس سے مراد ایک نور ہے جو مشہود حقیقی کی طرف سے عارف کی طرف آتا ہے اور وہ اس کے حواس کی تمام قوتوں اور ان کے افعال کو مٹا کر عارف کے اندر خود ان کی جگہ لے لیتا ہے۔ پھر وہ مشہود حقیقی کو اسی نور کے ذریعہ سے دیکھنے لگتا ہے اور اس

ملہ مدارج السالکین مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۲۲۲

ملہ یہ اشارہ صاف علم ثریا کی طرف ہے۔

نور کے ظہور کے بعد مشہود حقیقی کے سوا عارف کی نظر میں سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔“

شیخ الاسلام کی اس پوری محبت پر ایک نظر دوبارہ ڈال کر وہ نتائج سامنے رکھ لیجیے جو اس سے نکلتے ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو یہ سامنے آتی ہے کہ معرفت کے نقطہ نظر سے صوفیائے کرام کے نزدیک علم شریعت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ علم شریعت جس کی بنیاد نقل و روایت پر ہے ان کے نزدیک بالکل ابتدائی درجہ کی چیز ہے۔ معرفت کے نقطہ نظر سے جس علم کی اہمیت ہے وہ علم خفی ہے یا علم لدنی۔

علم خفی اور علم لدنی کو جس طرح نقل و روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی طرح عقل و استدلال اور فکر و استنباط سے بھی ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سراسر وجدان، کشف اور مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کے حصول کا راستہ تعقل، تفکر اور استنباط و اجتہاد نہیں ہے بلکہ مراقبہ، توجہ، ریاضت اور خلوت گزینی ہے۔

یہ علم عارف کے حواس کو محفل کو کے خود اس کی جگہ لے لیتا ہے اور عارف کو تمام دنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے مشہود حقیقی کے اندر گم کر دیتا ہے۔

یہ علم غیب کے تمام پردے اٹھا دیتا ہے۔ اور عارف تمام حقائق کا گویا برامی العین مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

اس بحث پر تنقید کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ معرفت کی حقیقت اور اس کے مدارج پر شیخ الاسلام نے جو کچھ لکھا ہے اس کو بھی مختصراً ناظرین کے سامنے رکھ دیں، تاکہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ معرفت کا معیار صوفیائے کرام کے نزدیک کیا ہے۔

سب سے پہلے شیخ الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ المعرفۃ احاطۃ بعین الشئ کا ہو۔ معرفت کسی شے کی حقیقت کا اس طرح احاطہ کر لینا ہے جیسی کہ فی الحقیقت وہ ہے۔

اس کے بعد علم کی طرح معرفت کے بھی شیخ الاسلام نے تین درجے قرار دیے ہیں اور لوگوں کو تین طبقات — عوام، خواص اور اخص الخواص — میں تقسیم کر کے ہر طبقہ کی معرفت اس کے درجہ کے اعتباراً

سے الگ الگ بتائی ہے۔

معرفت کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ خدا کی جن صفات اور کثمتوں کا مظاہرہ اس کی مخلوقات و مصنوعات میں ہو رہا ہے اور جن کا بیان نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہوا ہے، ان کی معرفت حاصل ہو۔ یہ معرفت عوام کی معرفت ہے۔

معرفت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ خدا کی ذات کی معرفت حاصل ہو اس طرح کہ ذات اور صفات کے درمیان کوئی تفریق نہ واقع ہو۔ یہ خواص کی معرفت ہے۔

معرفت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ خدا خود اپنی معرفت کا نور عارف پر ڈال دے اور عارف کی معرفت اس نور میں گم ہو جائے۔ اس معرفت تک نہ استدلال کی رسائی ہے، نہ اس تک کسی دلیل کی رہنمائی ہے اور نہ یہاں تک کسی وسیلہ کی پہنچ ہے۔ دل کا مشاہدہ، علم کے حدود و قیود سے آزادی اور مقام جمع کا مطالعہ اس کی خصوصیات ہیں۔ یہ انھیں الخواص کی معرفت ہے۔

اب اس بحث کا جو خلاصہ نکلتا ہے اس کو بھی پیش نظر رکھ لیجیے۔

معرفت کی تعریف یہ ہے کہ کسی شے کی اصل حقیقت کا، جیسی کہ وہ فی الواقع ہے، احاطہ کر لیا جائے۔ خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت جس کا ذریعہ انبیاء ہیں یہ ابتدائی درجہ کی معرفت ہے؛ معرفت کا اونچا درجہ حقیقت معرفت ذات کا درجہ ہے۔

حقیقی معرفت جو انھیں الخواص کا حصہ ہے وہ عقل و استدلال اور دلیل و شہادت سے ایک بالکل مادامتشے ہے۔ یہ معرفت جن کو حاصل ہو جاتی ہے وہ حقائق کو دلیل سے معلوم کرتے کے لئے ان کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، وہ علم کے حدود و قیود سے بالاتر ہو جاتے ہیں اور خود مشہود حقیقی کے اندر گم ہو جاتے ہیں تبصرہ | اب ہم ان مختلف راہوں پر مختصر تبصرہ کر کے یہ دکھائیں گے کہ ان میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا حصہ محض بے حقیقت خیال آرائی پر مبنی ہے۔

فلاسفہ اور متکلمین میں سے ہر ایک نے، جیسا کہ آپ نے دیکھا، ایک دوسرے کے بالکل ضد مسلک

نے معرفت کی یہ پوری بحث منازل السائرین سے ماخوذ ہے

اختیار کیا ہے۔ ایک گروہ عقل کو اس قدر اچھا سمجھتا ہے کہ انسان کو بالکل آسان پر چڑھا دیتا ہے اور دوسرا اس کو اس قدر گمراہ کرتا ہے کہ وہ بالکل تحت الشری میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک عقل کی رہنمائی پر اس قدر اعتماد رکھتا ہے کہ انسان کو کسی مافوق عقل رہنمائی سے بالکل ہی بے نیاز اور مستغنی ثابت کر دیتا ہے، دوسرا عقل کو اس قدر ناقابل اعتماد ٹھہراتا ہے کہ انسان کو بالکل بے بصیرت اور اندھا بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔ ہالانکہ انصاف یہ ہے کہ عقل نہ تو اس غیر معمولی احترام و اعتماد ہی کی مستحق ہے جس کا مستحق فلاسفہ نے اس کو گردانا ہے اور نہ اس توہین و تحقیر ہی کی سزاوار ہے جس کی سزاوار اس غریب کو متکلمین نے ٹھہرایا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر جو سب سے بڑا انعام فرمایا ہے وہ یہی ہے کہ اس کو عقل عنایت کی لیکن یہ عقل ایسی چیز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے بالکل کافی ہو اور اس کے بعد انسان کسی مافوق عقل رہنمائی کا محتاج نہ رہے۔ عین تمام خوبیوں کے باوجود اپنے اندر متعدد ایسی خامیاں بھی رکھتی ہے کہ اس کی رہنمائی نہ تو کامل ہو سکتی نہ بے خطا۔ اول تو یہ جن حواسوں سے کام لیتی ہے ان کی رسائی ہی بہت محدود ہے اس وجہ سے بہت سے سوالات خصوصاً مابعد الطبیعی سوالات کے حل میں اس کے یہ وسائل و وسایط بالکل ہی ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ اپنے حواسوں کی فراہم کردہ معلومات سے جو کلیات ترتیب دیتی ہے اور پھر ان سے جو نتائج نکالتی ہے ان میں بھی وہ غلطیوں سے محفوظ نہیں علاوہ انہیں وہ اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی بھی کر سکتی ہے، وہ لپیٹ بہت بھی ہو سکتی ہے، وہ مرعوب اور خوف زدہ بھی ہو سکتی ہے اور اپنے نفسانی میلانات و رجحانات کے حق میں جانب دار بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ تمام انسانوں کی عقلوں کو جمع کر کے ان سب کی رہنمائی پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ انہی نقائص کی بنا پر جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم اختلاف تو ان کے نتائج فکر میں لازماً رونما ہو کے رہے گا۔

تاہم عقل سے وہ مایوسی اور بے گمانی بھی بالکل غلط ہے جس کا اظہار متکلمین نے کیا ہے عقل کی رسائی محدود ضرور ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ وہ مابعد الطبیعی سوالات کے حل کرنے اور اخلاقی اقدار کی جانچ پرکھ کے معاملہ میں بالکل ہی کوری ہے ایک سختہ قسم کا سفسطہ بلکہ ایک کھلی ہوئی جہالت ہے عقل

اپنی کوتاہیوں اور نارسائیوں کے باوجود ہماری رہنمائی بہت دوز تک کر سکتی ہے۔ وہ اس کائنات کے مطالعہ اور اس کے اندر جو نظم و حکمت ہے اس کے مشاہدہ سے نہ صرف ایک خالق کا بلکہ اس خالق کی بہت سی صفوں کا بھی اندازہ کر سکتی ہے، وہ خالق کی صفات سے خالق کی پسند اور ناپسند کے متعلق بھی ایک تصور قائم کر سکتی ہے، وہ اس دنیا کے نظام اور اس کے سنن و قوانین کے مطالعہ سے ایک روز جزا و سزا کا بھی خیال کر سکتی ہے، وہ انسانی فطرت کے اندر ودیعت کردہ اخلاق و یقینیات سے خیر و شر کے اصول بھی متعین کر سکتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ کر سکتی ہے لیکن اس طرح نہیں کر سکتی کہ اس کے کیے ہوئے کو کامل سمجھا جاسکے یا اس کی صحت و صداقت پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکے۔ بس یہ حیرانی اس کے کام میں ایک ایسی حیرانی ہے جس کے سبب سے رہنمائی کے معاملہ میں تنہا اسی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ بالخصوص ایسے معاملات میں جن پر انسان کی حقیقی طمانیت و مسرت اور اس کی انفرادی و نوعی سعادت و کامرانی کا انحصار ہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فلاسفہ نے عقل پر جو اعتماد کیا ہے وہ بھی بالبداهت غلط ہے اور متکلمین نے اس کو جو بالکل خارج از بحث قرار دیا ہے وہ بھی صریحاً حقیقت کے خلاف ہے۔ حتیٰ ان دونوں کے درمیان ہے۔

اب آئیے شیخ الاسلام کے نظریات کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ ہم شیخ الاسلام کے خیالات کے اس حصہ کو زیر بحث نہیں لائیں گے جس میں کسی پہلو سے اختلاف رائے کی گنجائش ہے بلکہ ان کی صرف انہی غلطیوں کو سامنے لائیں گے جو بالکل واضح ہیں یہیں شیخ الاسلام کے نظریات پر مندرجہ ذیل اصولی اعتراضات ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شیخ الاسلام نے شریعت کے علم کو کشف مشاہدہ اور الہام کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کے مقابل میں حصول معرفت کے نقطہ نظر سے فروتر ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ یہ بات

ملہ یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ نظریات تنہا شیخ الاسلام (ابو اسمعیل حروری ہی کے ہیں۔ ہم نے شیخ الاسلام کو تمام اکابر تصوف کے ایک قابل اعتماد نمائندہ کی حیثیت سے منتخب کیا ہے۔ جو نظریات شیخ الاسلام کے ہیں کم و بیش وہی نظریات دیگر اکابر تصوف کے بھی ہیں۔ اور اگر کسی کے نظریات بنیادی طور پر شیخ الاسلام کے نظریات سے الگ ہیں تو اس کو تصوف کے مزہ بھی الگ سمجھنا چاہیے۔

بالبد اہت غلط ہے۔ علم شریعت کی بنیاد وحی پر ہے اور وحی میں کسی وہم، کسی وسوسہ، کسی نفسانی خیال آرائی اور کسی شیطانی دراندازی کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ انبیاء بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس علم کی بنیاد وجدان اور کشف و مشاہدہ یا الہام وغیرہ پر ہو اس میں ہر قسم کی شیطانی اور نفسانی مداخلت کا امکان ہوتا ہے کیونکہ کسی ٹبے سے بڑے عارف اور کسی بڑے سے بڑے صوفی کے متعلق بھی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ شیخ الاسلام نے علم لدنی کے بارہ میں نہ صرف یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ فکر و استنباط سے بالاتر ہے بلکہ اس کو بجائے خود دلیل کی حیثیت دے دی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صحت و صداقت کسی دوسری دلیل کی تصدیق و تائید کی محتاج نہیں ہے جس طرح ایک نبی کو وحی کے ذریعہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کی تصدیق و تائید کے لیے وہ کسی خارجی شہادت کا محتاج نہیں ہوتا اسی طرح ایک عارف اپنے وجدان یا اپنے کشف یا مشاہدہ یا الہام کے ذریعہ سے جو علم لدنی پاتا ہے اس کو بھی کسی اور کسوٹی پر اس کو جانچنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شیخ الاسلام کے نزدیک ”اس کا وجود ہی اس کی سند ہے“

ہمارے نزدیک شیخ الاسلام کی یہ بات دین میں ایک شدید قسم کا فتنہ ہے۔ علم خفی ہو یا علم لدنی اس کو بجائے خود دلیل تسلیم کر لینے کے معنی تو یہ ہوتے کہ عارفین کو انبیاء کا درجہ دے دیا جائے اور ان کے کشف و مشاہدہ اور ان کے الہام کو بالکل ہم پایہ وحی بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی شخص کے لیے اسلام پر قائم رہتے ہوئے تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ کشف و الہام کے ذریعہ سے علم کے حصول کے ہم منکر نہیں ہیں لیکن یہ علم قابل قبول صرف اسی حالت میں ہونا چاہیے جب یہ شریعت کے مطابق ہو اگر یہ شریعت کے خلاف ہو تو لازماً یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اس کو قبول کر لینا دیدہ و دانستہ اپنی باگ شیطانی کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔

اگر اس کشفی یا الہامی علم کو اس درجہ اہمیت دے دی جائے کہ یہ کتاب و سنت کی طرح بجائے خود دلیل بن جائے تو اس سے جس طرح کے فتنے پیدا ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہم شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فیوض الحرمین سے ان کی ایک ”تحتیں شریف“ نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

تحقیق شریف - الاولیاء کثیراً ما یجھرون
 بان الله تعالى استغفر عنهم التکلیف وانه
 خیرهم فی الطاعات ان شاء فعلوها وان
 لم یثبوا ولم یفعلوها - حکمی سیدی الوالد
 رضی الله عنه عن نفسه انه اللهم بهذا
 وانه دعا الله تعالى ان یقیم علیه التکلیف
 وما اختار الا التمس ولم یکین من مذهبه
 سقوط التکلیف عن احد من خلق الله
 مادام عاقلاً بالغاً فراً بینه یری الالمام
 خفا وبری مذهبه خفاً وینجبر فی التطبیق -
 واخیرت عن سیدی العزیز قدس سره ان
 کان یخبر عن نفسه انه اللهم لسقوط التکلیف
 وقیل له ان عبدت خوفاً من النار فانا قد
 اجبرناک عن النار وان عبدت طمعاً فی
 الجنة فانا وعدناک ان ندخلک ایهما
 ان عبدت طلباً للرضا فانا فقد رضینا عنک
 رضا لا یخط بعدہ فقال ربی انما عبدک
 لا شیء دونک - وکان قدس سره یمیل الی
 ان الکمل یسقط عنهم التکلیف والله سبحانه
 هو الذی یقیم علیهم النواامیس من غیر
 اختیارهم - هکذا روی عن کثیر من

ایک نہایت اعلیٰ تحقیق یہ ہے کہ بہت سے اولیاء پر یہ
 الہام کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام شرعی احکام
 کی تعمیل سے بری کر دیا ہے اور ان کو طاعت و عبادت
 کے معاملات میں اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو
 کریں اور اگر نہ چاہیں تو نہ کریں - مجھ سے میرے والد ماجد
 نے خود اپنے بارہ میں یہ بیان فرمایا کہ خود ان کو بھی اسی
 طرح کا الہام ہوا لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عا
 کی کہ وہ ان کے اوپر شرعی ذمہ داریوں کو قائم رکھے اور
 انہوں نے قوانین و احکام کی پابندی ہی کو اختیار کیا ان
 کا مسلک یہ نہیں تھا کہ کوئی عاقل و بالغ شرعی ذمہ داریوں
 سے بری قرار دیا جاسکتا ہے لیکن میں نے ان کو دیکھا کہ
 وہ اپنے اس الہام کو بھی حق سمجھتے ہیں اور اپنے اس مسلک کو
 بھی حق سمجھتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان تطبیق دینے میں ان کو
 کچھ حیرانی سی پیش آرہی ہے -

مجھے میرے عم بزرگوار کی نسبت بھی یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی
 اپنی بابت یہ فرماتے تھے کہ ان کو بھی شرعی ذمہ داریوں سے
 بریت کا الہام ہوا تھا ان کو غیب سے یہ کہا گیا تھا کہ اگر تم جہنم
 کے در سے ہماری عبادت کرتے تھے تو ہم نے تم کو جہنم سے
 پناہ دی اور اگر تم جنت کی آرزو میں ہماری عبادت کرتے
 تھے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم کو اس میں ضرور داخل
 کریں گے ، اور اگر تم ہماری خوشنودی کی طلب میں ہماری

اولیاء اللہ تعالیٰ عبادت کہتے تھے تو ہم تم سے ایسے راعی ہوئے کہ اب اس کے بعد کبھی ناخوش نہ ہونگے، تو انہوں نے کہا کہ اے رب میں تیری عبادت محض تیرے لیے کرتا ہوں کسی اور غرض کے لیے نہیں کرتا ہوں۔ علم بزرگوار کا میلان اس بات کی طرف تھا کہ کامین سے شرعی ذمہ داریاں ساقط کر دی جاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے اوپر ان کے اختیار کے بغیر قوانین شرعی کو جاری رکھتا ہے۔ اور اسی قسم کی روایت دوسرے بہتے اولیاء اور کامین سے ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اس قسم کے الہامات کو روحانی سمجھنے کا تعلق ہے شاہ صاحب کے والد بزرگوار اور علم بزرگوار دونوں حضرات ایک ہی رائے رکھتے تھے، البتہ ان دونوں بزرگوں کی رائیں اس بارہ میں مختلف تھیں کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بری کیا جاتا ہے یا نہیں؟ شاہ صاحب کے والد ماجد کا مذہب یہ تھا کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بھی بری نہیں کیا جاتا لیکن ان کے علم بزرگوار کا مذہب یہ تھا کہ کامین شرعی ذمہ داریوں سے بری تو کر دیے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے اختیار کے بغیر ہی ان کو تمام شرعی تکالیف کا پابند رکھتا ہے۔

خود شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس بارہ میں اپنے علم بزرگوار کے مسلک کے موید معلوم ہوتے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے علم بزرگوار کا مذکورہ بالا مسلک نقل کرنے کے بعد اس کا فلسفہ بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

والستر فی خالک عندی ان الانسان اذا انتقل عن الایمان بالغیب یحذوا النوامیس الی الایمان بھا علی بینۃ ووحید ہذا العبادۃ والنوامیس فی نفسہ مثل الجوع والعطش بما لا یقدر علی ترکہ فلا معنی لتعلق التکلیف بھالا نہما من الجبلۃ الی جبل علیہا۔

میرے نزدیک اس کے اندر مضرب ہے کہ آدمی جب ان شرعی احکام کو لیا غائبانہ کے درجہ سے نرتی کر کے ایمان شہادت (ایمان علی بینۃ) کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور ان عبادات و احکام کی طلب اپنے اندر اسی طرح محسوس کرنے لگتا ہے جس طرح بھوک اور پیاس کو محسوس کرتا ہے جن کے چھوٹنے پر وہ قادر نہیں رہتا تو پھر ان چیزوں کا اس کو مکلف بنائے رکھنے

کے کوئی معنی نہیں کیونکہ یہ چیزیں تو اب اس کی جبلت بن چکی ہیں جن پر وہ پیدا ہوا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ اس قسم کے الہامات کو اپنے والد ماجد اور علم بزرگوار

سے یہ عبارات فیوض الحرمین ص ۲۳، ۲۴ سے نقل کی گئی ہیں۔

کی طرح رحمانی سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کا ارشاد ہے والحق عندی ان الالمام کلمہ حق بلکہ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ کالمین جن کو ایمان بالغیب کی جگہ ایمان بالشہادۃ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے وہ شرعی تکالیف سے بری کر دیے جاتے ہیں۔ کیونکہ شرعی تکالیف ان کے لیے بالکل اضطراری نوعیت کی چیز بن جاتی ہیں جن سے انحراف ان کے لیے ممکن ہی نہیں رہ جاتا جس طرح وہ طبعی قوانین کی مجبوراً نہ اطاعت کرتے ہیں اور جس طرح وہ بے بس ہو کر جبلی تقاضوں کی تعمیل کرتے ہیں اسی طرح وہ شرعی احکام کی بھی تعمیل بالکل بے بس ہو کر کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو شرعی تکلیف کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد سے متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں جن میں سے بعض کا ہم پہلا ذکر کریں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اس دلیل کی بنا پر کہ ان کالمین کے لیے شرعی احکام و قوانین جبلی تقاضوں کی حیثیت حاصل کرتے ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کو شرعی احکام کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں تو بعینہ اسی دلیل کی بنا پر یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ جب یہ کالمین ان شرعی احکام کی تعمیل پر جبلی طور پر مجبور ہیں تو ان کی ذمہ داریوں سے ان کو بری قرار دینے کے بھی کوئی معنی نہیں۔ کیونکہ کسی چیز سے بری قرار دینے کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اختیار موجود ہو، جب اختیار ہی سلب ہو چکا تو بری قرار دینا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کو معذورین و مجبورین کے زمرہ میں شمار کیے جانے کے سبب سے غیر مکلف سمجھ لیا جائے۔ لیکن یہ مرتبہ اسلامی شریعت میں کالمین کا نہیں بلکہ نابالغوں اور مجانین کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام عذاب و ثواب اختیاری اعمال پر مقرر ہوتا ہے تو جب یہ اعمال ان کالمین کے لیے اختیاری باقی ہی نہیں رہے تو ان پر ان کو اجر و ثواب کس بات کا ملے گا؟

تیسری بات یہ ہے کہ انبیائے کرام کا ایمان قرآن کی تصریح کے مطابق ایمان علیٰ مینہ ہوتا ہے چنانچہ حضرت نوحؑ فرماتے ہیں اِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي (ہود، ۲۸) اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک بے پناہ نصرت صانع فرماتے ہیں ان كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي (ہود، ۶۳) حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں ان كُنْتُ عَلَىٰ

يَبْتِغِي مِنْ رَبِّي (۸۸- ہوں) لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی کے متعلق بھی کوئی ادنیٰ اشارہ نہیں اس بات کا نہیں ملتا کہ ان کو کبھی اس بات کا الہام ہوا ہو کہ ان کو شرعی تکالیف سے بری قرار دے دیا گیا بلکہ اس کے برعکس ان کو بار بار یہی تاکید ہوتی رہی کہ جو کچھ تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اس پر برابر جمے رہو اور سرمود اس سے تجاوز نہ کرنا۔ حالانکہ شرعی تکالیف اگر کسی کے لیے جہلی چیزیں بن سکتی ہیں تو وہ سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں لیکن جب وہ آخر دم تک مکلف رہے اور دوسروں سے زیادہ مکلف رہے تو تا بہ دیگران چہ رسد۔

ہمارے نزدیک اسی طرح کا الہام یا کشف کا مین کو ہو تو سکتا ہے لیکن ہم ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہ الہام یا کشف رحمانی بھی ہو سکتا ہے۔ رحمانی کشف اور رحمانی انقاد ہمیشہ بندہ کو صحیح سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ بندہ کو فتنہ میں نہیں ڈالتا۔ فتنہ میں ڈالنا شیطان کا کام ہے۔ یہ کام رحمان کا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہزاروں نبیوں اور رسولوں پر وحی نازل فرمائی لیکن یہ وحی ہمیشہ شرعی ذمہ داریوں کے اٹھانے کی تاکید کے ساتھ نازل ہوئی، نبی کے لیے بھی اور اس کی امت کے لیے بھی۔ ہم کو انبیاء کو پوسے گروہ میں سے کسی کے بارہ میں بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کو ایک مرتبہ بھی وحی یا کشف کے ذریعہ سے یہ بتایا گیا ہو کہ اب وہ شرعی فرائض اور ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ اگر انبیاء کرام کی زندگیوں میں اس طرح کی کوئی چیز ملتی ہے تو اس کی نوعیت یا تو شیطانی وسوسہ کی ہے جس سے انہوں نے اللہ کی پناہ مانگی ہے یا پھر انسانی داہمہ کی ہے جس کی انہوں نے اصلاح فرمائی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ جب آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دے گئے تو آپ نوافل میں اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ا فلا اکون عبدًا شکوئاً کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

اگر کاہلیت کا انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہوتا کہ کامل کو شرعی تکالیف ہی سے بری قرار دے دیا جاتا تو سب سے بڑھ کر کامل اور اکمل تو حضور خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی لیکن قرآن کی کسی آیت یا آپ کی کسی حدیث سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کو زندگی کے کسی دور میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی اس بات کے لیے ہوا ہو کہ آپ کو شرعی ذمہ داریوں سے کسی پہلو سے بھی سبکدوش کیا گیا ہے، بلکہ اس کے بالکل برعکس کمال عبدیت میں آپ جتنے ہی آگے بڑھتے گئے شرعی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی قدر بڑھنا گیا۔ ہم

یہاں چند آیتیں ایسی نقل کرتے ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی زندگی کے آخری دور میں اللہ کی بندگی میں زیادہ سے زیادہ سرگرم ہونے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ سورہ الم نشرح میں ارتداد ہوتا ہے۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ
پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو اپنے رب کی بندگی میں بھڑکے
ہو جاؤ اور اپنے رب کی طرف جھک پڑو۔

جس سورہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کی تائید کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب وفات کی پیش گوئی ہے عین اس سورہ میں آپ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ

إِذَا حَيَاءُ لَصَرُّ اللَّهِ وَالْقَتْمُ وَرَأَيْتَ
النَّاسَ يَدْعُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا. فَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا۔
جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ اور تم دیکھ لو کہ لوگ
فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے
رب کی محمکی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت
مانگو۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

ایک جگہ صاف صاف یہ ہدایت ہے کہ اپنے رب کی بندگی پر جمے رہو یہاں تک کہ موت آجائے۔
وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ
اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو یہاں تک کہ موت آجائے

تمام اہل تائید کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں یقین سے مراد موت ہے۔

بہر حال اس قسم کا اتقا خدا کی طرف سے تو ہو نہیں سکتا، اگر ہو سکتا ہے تو شیطان کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ وہ بلاشبہ کالمین کو اس معاملہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ آخرت کی غلج و کامیابی کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے انہوں نے کر لیا، اب مزید کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کوشش میں اگر اس کو کچھ زیادہ کامیابی بالفرض نہ بھی ہو، صرف اتنی ہی کامیابی ہو جائے کہ کوئی خدا کا بندہ اپنے عمل کو ذرا زیادہ محبت ہی دینے لگ جائے تو یہ بھی اس شخص کی آخرت کی بربادی اور شیطان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ و اہل تقویٰ اس فتنہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر شیطان کے اسی وسوسہ کو کوئی بزرگ اپنی سادہ لوحی سے بچ کر بچ جائے اور اس کی تعمیل میں تمام عمر عی تک ایف سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیں تب تو سمجھیے کہ شیطان کو سو فیصدی کامیابی حاصل ہوئی۔ ہمارے نزدیک اس قسم کے الہامی اور کشفی علوم کو بجا خود

دلیل اور عیار قرار دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے جس سے کسی طرح بھی بچا نہیں جاسکتا۔ اسی چیز سے ہزار بدعات پیدا ہوئی ہیں اور اگر اس کا دوا نہ کھلا رہے تو اس سے ہزار بدعات آئندہ پیدا ہو سکتی ہیں۔ بہت سے مبتدع مقلدوں نے اسی قسم کے غیبی اشارات کو آڑ بنا کر اپنے آپ کو شرعی ذمہ داریوں سے بری قرار دے لیا جس کے سبب سے وہ خود بھی گمراہ ہو گئے اور اپنے پیچھے چلنے والوں کو بھی انہوں نے گمراہ کیا۔ اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

۳۔ اس علم لدنی کے متعلق شیخ الاسلام نے یہ بھی لکھا ہے کہ لیس بدینہ و بین الغیب حجاب۔ اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہ جاتا۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہو گئے کہ جس کو علم لدنی حاصل ہو اس کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے جاتے ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک بالبداهت قرآن کے خلاف ہے۔ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اس کے سوا نہ کسی انسان کو حاصل ہے نہ کسی فرشتہ کو اور نہ کسی نبی کو نہ کسی ولی کو۔ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اونچا مرتبہ مبہیوں اور فرشتوں کا ہے لیکن قرآن مجید میں تصریح ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے نہ براہ راست خطاب کر سکتے نہ غیب سے واقف ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ اگر ان سے خطاب کرتا ہے تو یا تو وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی اوٹ سے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ان کے لیے سارے حجابات اٹھا دیے جائیں۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكْلِمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَكِيمٌ (۵۔ زخرف) اور کسی انسان کا یہ مرتبہ نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ سے یا اس کے پاس وہ اپنا کوئی فرستادہ (فرشتہ) بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے اس کی طرف وحی کر دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اللہ بہت بلند اور حکمت والا ہے۔

اسی طرح یہ بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے بندوں کی مصلحت کے لیے اپنے کسی نبی یا رسول کو اپنے غیب کی باتوں میں سے کچھ باتوں سے باخبر کرے۔ عَالَمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْمَعُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَهُدًى وَغُوبٍ كَمَا جُتِيَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الضَّالِّينَ (۱۰۹۔ آل عمران) اور اپنے غیب کے کسی کو باخبر نہیں کرتا۔ ہاں اگر کسی رسول کو منتخب کرے تو اس کے آگے اور پیچھے اپنے پرہ دار مقرر کرتا ہے۔

انبیاء کی دعوت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ بتاتے

ہی انہی لوگوں کو ہیں جو عقل و استدلال سے کام لینے، آفاق و انفس میں خدا کی جو نشانیاں ہیں ان پر غور کرنے اور ان کے نتائج کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ وہ ان لوگوں کو اپنی دعوت کے لیے بالکل ہیکار سمجھتے ہیں جو تفکر و تدبر کے بجائے ہر حقیقت کے مشاہدہ و معائنہ کے طالب ہوں۔ جو لوگ غیب کا مشاہدہ کر لینے کے بعد اللہ کو ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہیں قرآن میں ایک جگہ بھی ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس دنیا میں مشاہدہ غیب کو حکمت الہی کے بالکل خلاف اور اس قسم کے ایمان کو بالکل غیر معتبر قرار دیا گیا ہے۔ اس دنیا میں اصلی آزمائش ہی یہی ہے کہ آدمی مشاہدہ غیب کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور انبیاء کی گواہی کی بنا پر حق کو مانے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جان و مال کی قربانیاں دے۔ اگر فی الواقع کوئی ایسا علم ہے جو غیب کے پردوں کو اٹھا دیتا ہے اور وہ اس دنیا میں انسانوں کو حاصل بھی ہو سکتا ہے تو اس کے پانے کے سب سے زیادہ مستحق حضرات انبیاء کرام ہی ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس علم سے آگاہ نہیں کیا حالانکہ ان کی قوموں کی طرف سے برابر یہ مطالبہ رہا کہ وہ ایمان لانے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ان کو غیب کا مشاہدہ کرا دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب ملا کہ اس دنیا میں غیب کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ جو چیز انبیاء کو نہیں عطا کی گئی اور جس کا دیا جانا حکمت الہی کے خلاف قرار دیا گیا وہ صوفیوں کو حاصل ہو گئی؟

یہاں اس قصہ سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو جو سورہ کہف میں حضرت موسیٰ اور خضر کا بیان ہوا ہے۔ خضر کو جو علم عطا ہوا تھا اس کے متعلق قرآن میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ اس علم نے ان کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے تھے اس سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ لکھا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند معاملات میں خضر کو اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ بنایا تھا اور ان کے اوپر ان معاملات کی حکمت بھی کھول دی تھی۔ جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے انہوں نے خضر کی باتوں کو جو گوارا کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے یہ ہدایت ہوئی تھی کہ وہ ان کے پاس ایک خاص امر کی تعلیم کے لیے جائیں۔ ان کا خدا کی طرف سے خضر کے پاس بھیجا جانا خود اس بات کی دلیل تھا کہ خضر خدا کے

خاص بندے ہیں، ان کا علم قابلِ اعتماد ہے اور ان کا عمل خدا کے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے خضر کی ان باتوں کو جو ان کی لگاہ میں حق کے خلاف نظر آئیں محض اس وجہ سے گوارا کیا کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے خضر کے اوپر اعتماد کرنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ اگر وحی کے ذریعہ سے ان کو خضر پر اعتماد کرنے کی ہدایت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت موسیٰ خضر کے ایک فعل کبھی برداشت نہ کرتے۔ خود خضر نے بھی آخر میں حضرت موسیٰ کو یہی اطمینان دلایا کہ مَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَهْرٰی کہ یہ جو کچھ میں نے کیا ہے خدا کے حکم سے کیا ہے، اپنے جی سے نہیں کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خضر نے چند کام حضرت موسیٰ کے سامنے ان کو اس بات کی تعلیم دینے کے لیے کیے کہ خدا کے کام اگرچہ بظاہر کتنے ہی بے حکمت نظر آئیں لیکن ان کے اندر نہایت گہری حکمت ہوتی ہے جس کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ اور یہ کام انہوں نے براہِ راست خدا کے احکام کے تحت اسی طرح انجام دیئے جس طرح فرشتے اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ جس طرح فرشتوں کو بناتا ہے اسی طرح کسی انسان کو بھی اگر اس نے کسی مصلحت کے تحت کسی وقت بنایا تو اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ لیکن اس چیز کو آڑ بنا کر کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی اقدام شریعت کے خلاف کرے اور جب اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کا یہ فعل شریعت کے خلاف ہے تو وہ یہ جواب دے کہ میں نے یہ براہِ راست خدا کے حکم کے تحت اس کی مشیت کی تنفیذ کی ہے کیونکہ دوسروں کے پاس اس کے صدق و کذب کے جانچنے کا ذریعہ وحی الہی ہی ہے اور وحی الہی آنحضرت صلیم کے بعد منقطع ہو چکی ہے۔ اب حق و باطل کی کسوٹی قرآن و سنت ہے۔ اگر کسی شخص کا فعل کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ اس غدر پر کتاب و سنت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا کہ اس نے یہ جو کچھ بھی کہا یا کیا ہے علم لدنی کی رہنمائی کے تحت کیا ہے اور یہ علم بجاٹے خود دلیل ہے اس کو کسی اور کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ تسبیح الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ المعرفة احاطة بعین الشیء لما هو۔

معرفت یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت کا جیسی کہ وہ ہے احاطہ کر لیا جائے۔ معرفت کی اس تعریف کی رو سے کسوٹی سے ادنیٰ چیز کی بھی معرفت نہیں حاصل کی جاسکتی چہ جائیکہ خدا کی ذات اور اس کی صفات اور

اس کے افعال کی معرفت حاصل ہو سکے۔ اس طرح کی معرفت ہم اُس ہوا کی بھی حاصل نہیں کر سکتے جس کے نام سانس لیتے ہیں، اُس پانی کی بھی نہیں کر سکتے جس کو پیتے ہیں، اُس سورج کی بھی نہیں حاصل کر سکتے جس کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔ جدید ہے کہ اس طرح کی معرفت اگر ہم خدا اپنے وجود کی بھی حاصل کرنا چاہیں تو یہ ہمارے لیے محال ہے۔ اگرچہ ہمارے وجود سے زیادہ ہم سے قریب تر کوئی شے نہیں ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس طرح کی معرفت ہم زمین پر بیٹھنے والی کسی ننھی سی چھوٹی کی بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر غور کیجیے کہ انسان جب اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بھی کما حقہ معرفت حاصل نہیں کر سکتا تو اس کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے جو ہمارے خیال و گمان اور قیاس و وہم سے بالکل بالا تر ہے۔ ع

اے بڑے تر از خیال و قیاس و گمان و وہم

۵۔ معرفت کی اس تعریف کے بعد ستم یہ ہے کہ خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت کو باطل ابتدائی درجہ کی چیز بتایا گیا ہے۔ معرفت کا دوسرا درجہ جو خاص کا حصہ ہے ان حضرات کے نزدیک معرفت ذات سے شروع ہوتا ہے حالانکہ انسان خدا کی ذات کی کما حقہ معرفت تو دیکھتا ہے اس کا سرے سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خدا کی صفات مثلاً سمع، بصر، علم، قدرت وغیرہ کا تصور تو انسان کچھ کر سکتا ہے (اگرچہ وہ کتنا ہی ناقص ہو) کیونکہ ان صفات کی ایک بھکت اپنے اندر بھی پاتا ہے لیکن خدا کی ذات کا تصور کرنے کے لیے تمام کے تمام ذخیرہ معلومات میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے جن تھوڑی بھت کی ہے خدا کی صفات، اس کے افعال اور اس کے قوانین و سنوں سے کی ہے۔ اس کی ذات سے کوئی بھت نہیں کی ہے۔ اور اس بھت کی صاف تصریح کہ دی ہے کہ اس دنیا میں انسان خدا کی ذات کی تجلی کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ احادیث میں خدا کی ذات کے سوال پر خود کرنے کی ممانعت بھی کی گئی ہے کیونکہ اس سوال پر غور کرنے کے لیے انسان کے پاس سرے سے کوئی ذریعہ ہے ہی نہیں۔ مگر وہ اس سوال پر غور کرے گا تو حیرانی و دماندگی کے سوا اس کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اور حیوانی و درماندگی بھلے اس کے کہ انسان کو کچھ سے اس سے وہ بھی چھین لیتی ہے جو اس کے پاس پہلے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بھت کا تو حضرت صوفیائے کرام کو بھی اقرار ہے کہ جس کو تجلی ذات کا مشاہدہ ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات فرائض و

واجبات بھی چھوڑ بیٹھتا ہے۔ ہمارے نزدیک تجلّی ذات اول تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کے درپے ہو تو وہ کچھ پانے کے بجائے اُلٹے وہ بھی کھو آتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔

۴۔ معرفت کا قیصر اور جب جس کو انھیں الخواص کا حصہ قرار دیا گیا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ خالص مشدّد الوجود کا تصور پیش کرتا ہے اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کو علم کے حدود و قیود سے بالکل بالاتر کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم سے مراد علم شریعت ہے جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ علم شریعت نہ تو اس معرفت کا وسیلہ و ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور نہ وہ اس معرفت پر کوئی حکم ہی لگا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ ان حضرات کے نزدیک عارف ایک صاحب حال ہے اور ایک صاحب حال نے کشف اور مشاہدہ جو کچھ حاصل کیا ہے اس پر مجرد ایک صاحب حال کو کوئی حکم لگانے کا حق نہیں ہے؛ ہمارے نزدیک یہ نظر یہ بنیادی طور پر شریعت کے خلاف ہے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارہ میں انسان کو اپنے جی سے کچھ کہنے کا حق نہیں دیا ہے بلکہ صاف صاف فرمایا ہے کہ اپنی ذات و صفات کو اللہ تعالیٰ خود ہی جانتا ہے، انسان اس کو اپنے محدود فناء علم سے کما حقہ نہیں جان سکتا۔ اس وجہ سے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ظن و گمان اور اپنے کشف و مشاہدہ کی بنا پر خدا کے بارہ میں کچھ کہنے کے بجائے اللہ کی وحی کو رہنما بنائے اور اس کے بارہ میں وہی کچھ مانے جو خود اس نے اپنے متعلق بتایا ہے۔ فَلَا تَقْضُ وُدًّا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَلْمِزُوْنَ لَا تَعْلَمُوْنَ (۴)۔ نخل؟ پس تم اپنے جی سے اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، اپنے آپ کو اللہ ہی جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ اگر کوئی شخص خدا کے بارہ میں کوئی ایسا تصور پیش کرتا ہے جو خود خدا کے پیش کردہ تصور سے مختلف ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس کو اپنے کشف یا مشاہدہ کے ذریعہ سے خدا کی یہی معرفت حاصل ہوئی ہے تو لازماً یہ مانا پڑے گا کہ شخص کو کسی مہم میں مبتلا ہے یا غفلت میں کر رہا۔

خدا کی معرفت کے بارہ میں صحیح مسئلہ اس تفصیل سے یہ بات وضع ہوگئی کہ خدا کی معرفت سے متعلق فلاسفہ متبعین اور بابائے تصوف نے جو نقطہ نظر پیش کیے ہیں ان میں سے ہر ایک کے اندر کچھ نہ کچھ غلط ہے۔ اب ہم مختصر انباتیں گے کہ خدا کی معرفت کا بالکل صحیح اور قابل اطمینان ذریعہ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک خدا کی معرفت کا صحیح اور قابل اطمینان ذریعہ انبیاء علیہم السلام ہیں لیکن ہمارے اس کہنے کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ عقل و فطرت کو یا وجدان اور کشف کو معرفت الہی میں سرے سے کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ عقل یا کشف وغیرہ کے ذریعہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے اس میں غلطی اور ہم کے امکانات ہیں اور انبیاء کا طریقہ عقلی اور ہم کے تمام امکانات محفوظ ہے۔ انہما کے طریقہ میں جو غلطیاں ہیں ان کے عقل اور فطرت ہی پر ہے اور اس کے اندر

وجدان اور کشف کو بھی دخل ہے لیکن ان کے طریقہ میں چونکہ عقل یا وجدان تنہا کام نہیں کرتے بلکہ وحی الہی کی رہنمائی بھی ان کی مدد کرتی ہے اس وجہ سے اس طریقہ میں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ انسان کسی غلطی یا گمراہی میں مبتلا ہو سکے۔ انبیاء علیہم السلام کو جیسا کہ ہم نے عرض کیا، وحی کے ذریعہ سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ وحی کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے اس علم کو قرآن کی اصطلاح میں العلم کہا گیا ہے۔ العلم یعنی علم حقیقی جو تمام علوم کا سرچشمہ ہے، جو انسان کے لیے حقیقی صلاح و فلاح کی راہ دکھاتا ہے، جو اس کے قلب اور اس کی روح کو سچی طاعت اور سکینت بخشتا ہے، جو اس کی دنیا کو بھی سنوارتا ہے اور اس کی آخرت کو بھی روشن کرتا ہے، جو ہر قسم کے اختلاط و التباس اور ہر قسم کے شبہ سے بالاتر ہے، جس میں کسی قسم کے وہم یا دوسوہ کی کسی آمیزش کا اندیشہ نہیں ہے، جو ہر قسم کی شیطانی دخل اندازی سے بالکل محفوظ ہے، جس کو دینے والا خدا ہے، جس کو لانے والے جبریل امین ہیں اور جس کو دنیا میں پھیلانے والے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس کو دنیا میں آمارتے وقت اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی دونوں جگہ اس امر کا اہتمام فرمایا کہ نہ شیاطین الحق اس کے قریب چٹک سکیں اور نہ شیاطین الانس اس کے اندر کوئی خرابی پیدا کر سکیں۔ جس کی عظمت

لے نزول وحی کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے وحی کو ہر قسم کی شیطانی دسترس سے محفوظ کر دیئے کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ آسمان کے اندر شیطانوں کی آمد و شد بند کر دی اور ان کو روکنے کے لیے نہایت مضبوط قسم کا پہرہ لگا دیا۔ سورہ جتن میں اس کا ذکر خود جنوں کی زبان سے یوں ہوا ہے۔ **وَاِنَّا لَمُسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدَا مَا هَامِلَتٌ حُرُوسًا شَدِيدًا وَشُهُبًا وَانَّا لَنَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمِجِ طَقَمُنْ كَيْبِنَمِخِ الْاَنَ بَجِدْ لَهُ يَشْهَابًا رَصَدًا** (اجن، ۱) ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو ہم نے پایا کہ اس کو سخت قسم کے پہرہ داروں اور شہاب ثاقب سے بھر دیا گیا ہے۔ انہم ہمیں میں استراق سمع کے لیے گھات کی جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو استراق سمع کے لیے گھات لگائے گا تو وہ ایک شہاب ثاقب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

۱۔ اسی طرح شیاطین الانس اللہ کے آمارے ہوئے علم اور اس کے دین میں جو گھپلا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کو روکنے کا بھی اس نے انتظام فرمایا۔ **فَيَسْمَعُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يَجْعَلُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ** (ج، ۲) پس اللہ مانتا ہے اس چیز کو جو شیطان ملانے کی کوشش کرتا ہے پھر اللہ اپنی آیتوں کو مستحکم کرتا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

اور پاکیزگی اور جس کے محافظین و حاملین کے صدق و وفا کی شہادت خود اس کے آئینے والے نے ان الفاظ میں دی ہے:-

فِي صُحُفٍ مَّكْرُومَةٍ، مَرْفُوعَةٍ مَّكَرُومَةٍ،
گرامی صحیفوں میں، بلند اور پاکیزہ، باوقار اور باوقار
پائیداری سَفَرَةٍ کِیْرَامٍ بَعْدَرَةٍ (۱۳-۱۶-عین) منشیوں کے ہاتھوں میں۔

جس کی معنوی قدر و قیمت کی شہادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی:-
ان هذا القرآن حبل الله، وهو
النور المبين والشفاء النافع وعصمة من
تمسك به ونجاة من تبعه
یہی قرآن اللہ کی رسی ہے، یہی نور مبین ہے اور شفاء
نافع ہے، یہی اس کی پناہ ہے جو اس کو مضبوطی کے
ساتھ پکڑے۔ اور اس شخص کے لیے وسیلہ نجات ہے جو
اس کی پیروی کرے۔

جس کے بارہ میں حضرت علیؑ نے جو تمام ارباب تصوف کے نزدیک سب سے بڑے عارف ہیں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کی ہے۔
قال اما انی سمعت رسول الله صلی
الله علیه وسلم یقول الا انها ستكون فتنة-
قلت فما المخرج منها یا رسول الله - قال
كتاب الله فیه نیا ما قبلکم وخیر ما بعدکم
وحکم ما بینکم وهو الفصل لبس بالهزل
من ترکہ من حیا رقصه الله ومن ابتغی
الهدی فی غیرہ اضله الله وهو حبل الله
المتین وهو الذکر الحکیم وهو الصراط
المستقیم وهو الذی لا ترغ به الالهواء و
لا تلتبس به الالسه ولا تشبع منه العلماء
فرمایا یا رکھو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
یہ بات سنی ہے کہ آپؐ فرمایا کہ عنقریب ایک بڑا فتنہ
سراٹھائے گا۔ میں نے عرض کیا اس سے نجات کیا چیز
دلائلگی یا رسول اللہ؟ آپؐ فرمایا، اللہ کی کتاب۔ اس
میں تمہارے اگلوں کی مرکز نشت ہے، جو کچھ بعد میں لے
والا ہے اس کی خبر ہے اور جو کچھ تمہارے درمیان پیدا
ہوگا اس کا فیصلہ ہے۔ اور یہ ایک دلوک بات ہے
کوئی ہنسی دل لگی نہیں ہے۔ جو سرکش اس کو چھوڑے گا
اللہ اس کی پشت کی ٹہنی توڑ دیگا۔ جو اس کے سوا کوئی
اور مرجع ہدایت بنائے گا اللہ اس کو گمراہ کر دے گا۔

ولا یخلق علی کثرة السرد ولا تنقض عجائبه
وهو الذی لم تنته الجن اذا سمعته حتی
قالوا انا سمعنا قرانا عجبا یهدی الی
الرشد فامتابه، من قال به صدق
من عمل به اجر، ومن حکم به
عدل ومن دعا الیه هدی الی صراط
مستقیم (ترمذی)

خدا کی مضبوط رسی یہی ہے، حکمت سے بھری ہوئی کتاب
یہی ہے، خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ یہی ہے، اس کے
ہونے ہوئے خاموش نہیں گمراہ کرتیں اور زبانیں نہیں
لڑکھڑاتیں، علماء اس سے کبھی نہیں آسمان ہونے لگتی
ہی پڑھو اس سے سیری نہ ہوگی، اس کے عجائب حکمت
کبھی ختم نہیں ہوں گے، اس کے سنتے ہی جنات پکاؤٹے
ہم نے عجیب و غریب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف

یلاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے جس نے اس کی سند پر کہا سچ کہا، جس نے اس پر عمل کیا اجر پائے گا، جس نے اس
کی مدد سے فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراطِ مستقیم کی دعوت دی۔
یہی علم ہے جس کے بارہ میں ہم اور پرانہی حضرت علیؑ کا ایک قول نقل کر آئے ہیں۔

سئل علیؑ هل حقکم رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم لبتی دون الناس فقال لا
والذی خلق المحبة وبرأ النمة الافما یوتیه
اللہ عبدانی کتابہ۔

حضرت علیؑ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مخصوص علم ایسا بھی سکھایا تھا
جو دوسروں کو نہ سکھایا ہو۔ آپ نے جواب دیا کہ نہیں
اس ذات کی قسم جس نے غم کو چھایا اور خلق کو پیدا کیا مجھ
آپ نے اس قسم کا کوئی علم نہیں سکھایا۔ البتہ وہ فہم ہے
جو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کا کسی بندے کو عطا فرمائے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ علم خاص جو حضرت علیؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی درحقیقت
وحی الہی کے فہم ہی کا ثمرہ تھا اس سے کوئی علحدہ چیز نہیں تھا۔

وحی الہی کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ارباب تصوف کے علم غنی یا علم لدنی کی طرح
عقل و فطرت سے بالکل ماموا مشے نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے عقل
اور فطرت ہی پر ہوتی ہے۔ قرآن کہیں بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں جو تم سے کہی جا رہی ہیں ان کا وجود ہی

ان کی سند ہے یا یہ خود ہی دلیل اور خود ہی مدلول نہیں بلکہ وہ ہر جگہ یہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اپنی باتوں کا مطالبہ کرتی ہے اور تمہاری فطرت ان کی صحت اور صداقت پر گواہ ہے۔ وہ ان چیزوں کو باقاعدہ منطقی طریقہ پر ثابت کرنے کے لیے آفاق اور انفس کے اندر سے دلیلیں پیش کرتا ہے اور اس خوبی اور اس وضاحت کے ساتھ ان کو ثابت کرتا ہے کہ کوئی مہٹ و حرم ہی ان کا انکار کر سکتا ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ وحی الہی ہماری اپنی ہی فطرت کے مدفون خزانہ کو ہماری نگاہوں کے سامنے کر دیتی ہے اور ہماری ہی عقل کو ہمارے اوپر گواہ بنا دیتی ہے۔ اگر یہ کام ہم خود کرتے تو اس میں غلطیوں کا امکان تھا اور یہ غلطیاں ہماری دنیا اور آخرت دونوں میں ہمارے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام وحی کے ذریعہ سے انجام دے دیا جو ہر شک و شبہ سے بالا ہونے میں اہل تصوف کے کشف و مشاہدہ سے کہیں ارفع ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس میں کما حقہ فہم و بصیرت حاصل کرے تو اس کو وہ نور یقین اور شہرِ صدر بھی حاصل ہو جائے جو اصل مقصود ہے۔ اور جس کو حاصل کرنے کے لیے صوفیہ طرح طرح کی ریاضت کر کے کشف اور مشاہدہ کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت علیؑ نے اپنے مذکورہ بالا قول میں اشارہ کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صوفیوں کے علم حنفی یا علم لدنی کی طرح انبیاء علیہم السلام کا علم عقل کو منطوق اور خبرہ نہیں بناتا بلکہ وہ تمام بنیادی معاملات میں رہنمائی کر کے عقل کو صحیح اور قطعی نتائج تک پہنچا دیتا ہے اور اس طرح وہ اس کی ایسی تربیت کر دیتا ہے کہ بقیہ مسائل میں وہ آپ سے آپ صحیح طرز پر سوچنے لگ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بار بار مخاطب کو تعقل، تفکر اور زندگی کی دعوت دی گئی ہے۔ تعقل کا منشا یہ ہوتا ہے کہ آدمی زندگی کے معاملات میں محض جذبات، شہوات اور خواہشات کو اپنا رہنما نہ بنائے، اور نہ اوہام و خیالات کے ہاتھ میں اپنی باگ دے بیٹھے، بلکہ اس کے ذریعہ تعقل جو عقل رکھی ہے اس کو رہنما بنائے اور اس کی رہنمائی پر اعتماد کرے۔

تفکر کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ عالم کے قوانین و احکام اور فطرتِ انسانی کے مطالبات اور تقاضوں پر حکیمانہ طور پر غور کیا جائے اور ان سے زندگی کے لیے جو اصول پیدا ہوتے ہیں ان کو پوری

سجائی اور ایمان داری کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔

تذکرہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن بدیہیات پر یقین رکھتا ہے ان بدیہیات کو جذبات و شہوات کی بھیل کے اندر بھی یاد رکھے اور پھر ان سے بالکل لازمی طور پر جو نتائج نکلتے ہیں ان کو بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تسلیم کرے۔

الغرض وحی الہی ہم کو خدا کی معرفت کی منزل تک ہماری عقل پر پٹی باندھ کر نہیں لے جاتی بلکہ وہ ہماری عقل ہی کو آفاق و انفس کے لغز خدا کی صفات اور اس کے سنن و قوانین کا مشاہدہ کراتی ہے اور پھر ان صفات اور ان سنن و قوانین سے جو اخلاقی اصول پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان سے زندگی کے لیے جو منابطہ بنتا ہے ان کو ہمارے سامنے رکھتی ہے اور پھر اس سے جزا و سزا اور آخرت کے لیے جو رہنمائی ملتی ہے اس کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس طرح ہماری عقل ایک بالکل مامون ہادی کی رہنمائی میں خدا کی معرفت کے اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جہاں تک اس کے اندر پہنچنے کی صلاحیت ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ درحقیقت قرآن حکیم ہے جو خدا کی معرفت کا اصلی ذریعہ ہے اور اسی کے تدبیر سے انسان کو تعقل، تفکر اور تذکرہ کی وہ صحیح تربیت ملتی ہے جس سے انسان خدا شناس اور خدا رسی کا اہل بنتا ہے۔ اور اس راہ میں اس منزل تک پہنچتا ہے جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہے۔